امیر خسرو دھلوی

حیات اور شاعری

سید صباح الدین عبد الرحمن

مذکورہ بالا کتاب نیشنل کمیٹی برائے سات سوسالہ تقریب امیر خسرو کی طرف سے ۱۹۷۶ میں شائع ہوئی تھی - اس کی طباعت نیشنل بک فاؤنڈیشن کی نگرانی میں ہوئی - مصنف پروفیسر ممتاز حسین ھیں جو کئی کتابوں کے مصنف ہونے کی وجہ سے پاکستان کے ممتاز ادیب اور نقاد ھیں - ان دنوں سراج الدولہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل اور کراچی یونیورسٹی میں اردو کے کئی پوسٹ گریجویٹ طلبہ کے اعزازی ریسرچ گائڈ بھی ھیں - زیر نظر کتاب کے لکھنے میں انھوں نے بظاھر بڑی محنت اور کاش سے کام لیا ھے مگر اس کے غائر مطالعہ کے بعد اندازہ ھوگا کہ اس کے مباحث زیادہ تر غیر تسلی بخش بلکہ غیر صحیح تحقیقات، قیاسات اور تاویلات پر مبنی ھیں - جن کے ذریعہ سے مصنف نے امیر خسرو کی حیات کی ان تمام دل آویزیوں اور رعنائیوں کو زائل کرنے کی کوشش کی ھے جو اب تک لوگوں کے ذھن پر چھائی ھوئی تھیں - ان کی تمام تحقیقی تعبیرات اور ظنیات پر بحث کرنے میں میری یہ تحریر ناظرین کے لئے شاید صبر آزما ھو جائے اس لئے ان کی بعض باتوں کی طرف ذھن منتقل کرانے ھی سے پوری کتاب کی نوعیت کا اندازہ ھو جائے گا -

امیر خسرو کی زندگی سے لے کر اب تک تذکرہ نگاروں، مورخوں اور نقادوں میں سے کسی نے ان کی سیرت اور کردار پر وہ حرف گیری نہیں کی ھے جو زیر نظر کتاب کے مصنف نے کی ھے - غیر مسلم اھل قلم بھی ان کے

اخلاق کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی کے معترف رہے ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے مشہور مورخ ڈاکٹر تارا چند رقمطراز ہیں کہ خسرو صوفی منش درویش انسان تھے، ان کی نگاہ بلند تھی، ان کے دل میں وسعت تھی . . . وہ شریعت کے پابند سختی سے تھے (مضمون امیر خسرو اور ہندوستان، بحوالہ امیر خسرو، مرتبہ شیخ سلیم احمد، شائع کردہ ادارہ ادبیات دھلی، ص ۳۶۳، ۳۹۰) مگر جناب پروفیسر ممتاز حسین نے امیر خسرو کی سیرت کی جو تصویر پیش کی ہے اس کی کچھ جھلکیاں یہ ہیں۔

''انھوں نے (یعنی امیر خسرو نے) اپنی زندگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے، اپنی تمام سیہ کاریوں کا ذکر کیا ہے،، (ص ۱۴۳)

یہ سیاہ کاریاں مصنف کے خیال کے مطابق یہ تھیں :-

''وہ عاشق مزاج اور عشق باز تھے۔ وہ مسلسل عشق کرتے رہنے میں ایمان رکھتے۔ وہ ایک گائیک اور نائیک بھی تھے، اور ان کی صحبت ڈھاری ڈفالی، سازندوں کے ساتھ بھی رہتی،، (ص ۳۴۳)

ان کی عشق بازی اور عشق مزاجی کی تفصیل لکھنے اور ان کی محبوباؤں کی نشاندھی سے گریز کرکے وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں۔

''ان کا کیش عاشقی اور صنم پرستی بھی کافرکشی، تفریق اسم، مدعیان دین و ملت کی زرق سازی کے ردعمل میں تھا،، (ص ۴۰۶) پھر اسی کے ساتھ یہ فیصلہ بھی صادر کردیا ہے کہ :

''انھوں نے نہ تو کہیں اپنے کو پارسا ظاہر کیا ہے اور نہ صوفیت بگھاری ہے، بلکہ ہمیشہ اپنے ایک رند اور قلندر ہونے پر فخر کیا ہے،، (ص ۴۰۶)

مصنف نے امیر خسرو کو طماع، ہوس زر میں مبتلا، کذب گو اور سیہ رو بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ ان کی کتاب کے ان اقتباسات سے ظاہر ہوگا:-

''انھوں نے اپنی طماع طبعیت کو لگام دینے کی بارہا کوشش کی اور اپنے اس عزم کا بھی اظہار کیا کہ اب میں ہوس زر نہیں کرونگا اور قناعت کو راہ دونگا، لیکن ترک دنیا کا ارادہ کبھی بھی نہ کیا،، (ص ۲۰۹-۲۰۸)

''جو ہوس زر کہ خسرو کے نفس میں تھی اور جس کے نتیجے میں انھوں نے ایک سے ایک بدکردار سلاطین کی مدح لکھی اور جس کو وہ اپنی سیہ روی اور کذب گوئی سے تعبیر کرتے ہیں، خواہ وہ اس میں کامیاب ہوئے یا نہیں، لیکن ان کی سیہ‌روی کو جو ان کی کذب گوئی سے پیدا ہوئی، ان کی عاشقی اور حسن پرستی کی بدنامی سے خلط ملط نہ کرنا چاہئے،، (ص ۲۲۸)

وہ ایک جگہ تو یہ تک لکھ گئے ہیں کہ:-

''زندگی کا کوئی بھی لطف ایسا نہ تھا جو خسرو نے اٹھایا نہ ہو لیکن عہد علائی میں مفلسی اور اثر شیخ کی وجہ سے اپنی ماضی‌کی زندگی سے شرمندہ ہو چکے تھے،، (ص ۲۳۰)

یہ لکھنے کو تو لکھ گئے، لیکن خسرو کی اس شرمندگی کو یہ لکھ کر زائل بھی کر دیا ہے کہ:

''ہمارا یہ شاعر جو زندگی اور اس کی لذتوں کا دلدادہ تھا، وہ اس زمانہ میں جب اس کی عمر ستر سال سے زیادہ تجاوز کر گئی تھی اسی قسم کے جذبات رکھتا اور اسی قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا،، (ص ۳۱۴)

گویا ستر سال کی عمر میں بھی امیر خسرو کی سیہ کاریاں جاری رہیں - یہ نئی

تصویر ہندوستان کے اس بلبل ہزار داستان، فخر القراء، اعلم علماء برہان الفضلاء اور امیر الاولیاء کی ہے جو امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کہلاتے ہیں اور جن کی سیرت لکھنے میں ان کے بعض سوانح نگار یہ لکھتے ہیں کہ ان کے اوصاف و کمالات کا حال وہی لکھ سکتا ہے جو ویسا ہی صاحب کمال ہو۔

ہو جو اس جیسا تو اس کا وصف لکھے　　آج اس جیسا مگر پیدا کہاں

(حیات خسرو از مفتی محمد سعید مارہروی بحوالہ امیر خسرو مرتبہ سلیم احمد ص ۱۱۸ - ۱۱۷)

مصنف نے امیر خسرو کی سیرت کو داغدار زیادہ تر ان کی دربار داری ہی کے سلسلہ میں کیا ہے۔ ان کو سیاہ کار، کذب گو، سیہ رو، عشق باز، رنگین زندگی گزارنے والا (ص ۱۸۰) ڈھاری اور ڈفالی کی صحبت میں رہنے والا، رند، طماع، ہوس زر میں مبتلا، ستر سال کی عمر میں زندگی کی لذتوں کا دلدادہ، ابن الوقت (ص ۲۱۲) تاریخی عمل کے پہیے میں پھنسا ہوا (ص ۲۱۳)، وغیرہ جو کچھ کہا ہے وہ گویا ان کی دربار داری کے نتائج تھے۔ ذہنیت ہر قسم کی ہوتی ہے جو جیسی ذہنیت رکھتا ہے اسی قسم کے اس کے خیالات بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے جس ایک بات میں اچھے اور روشن پہلو دیکھے جا سکتے ہیں، اس میں برے اور تاریک پہلو بھی نکالے جا سکتے ہیں۔ سیرالاولیاء کے مصنف نے امیر خسرو کی دربار داری کے متعلق یہ لکھا ہے کہ ان کا مسلک

کمر بخدمت سلطان ببند و صوفی باش

تھا۔ سیر الاولیاء کے مصنف کو امیر خسرو کی دربار داری میں کوئی بات قابل اعتراض نظر نہیں آئی، اس لئے انھوں نے ان کے تمام محاسن کا ذکر دل کھول کر کیا ہے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کو امیر خسرو کی دربار داری میں

جو روشن پہلو نظر آیا اس کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ بادشاہوں سے خسرو کے تعلقات تھے، ملوک و امراء سے خوش طبعی اور ظرافت آمیزی کا میل جول تھا لیکن ان سب کی طرف ان کا دل متوجہ نہ تھا۔ جو بخوبی اس طرح آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ ان کے کلام میں جو برکات ہیں وہ سب فیض مشایخ کے آثار ہیں۔ کیونکہ گناہ گاروں کے دل برکات سے محروم ہوتے ہیں تو ان کے کلام کو نہ مقبولیت ہوتی ہے اور نہ ان میں تاثیر قلب میسر ہوتی ہے (اخبار الاخیار ص ۹۴ - ۹۲ (نیز دیکھو اس کا اردو ترجمہ) خزینۃ الاصفیاء کے مصنف نے بھی امیر خسرو کو امیر الاولیاء خسرو ملک بقا اور طوطی گوینده هندوستان لکھ کر تحریر کیا ہے کہ

اگرچہ به بادشاهاں صحبت داشت اما از دل متوجه بجناب مشایخ بود (جلد اول ص ۳۴۲ - ۳۳۹)

ممکن ہے کہ ہمارے مصنف کو ان اصحاب دل تذکرہ نگاروں کی رائے سے اتفاق نہ ہو مگر جس طرح انھوں نے خسرو کی دربار داری کا تجزیہ اپنے زاویہ نظر سے کیا ہے اس طرح دوسروں کو بھی اپنے اپنے زاویوں سے اس کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے کا حق ہے۔

خسرو اپنے عہد کے تمام سلاطین کے بہت ہی چہیتے اور قابل احترام ہمجلیس اور ہمدم بنے رہے۔ ہر سلطان خواہ وہ کیسا ہی ہو، ان کی ذاتی خوبیوں اور شاعرانہ کمالات کا دم بھرتا رہا۔ آخر کیوں؟ ان کی وجاہت، ان کی ذکاوت ان کی صلح کل اور مرنجان مرنجح طبعیت، ان کی بذلہ سنجی، ان کی شیریں بیانی، ان کی حاضر جوابی اور ان کی خوش اخلاقی پورے دور میں ایسی نمایاں رہی کہ کوئی فرمانروا ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ بقول ڈاکٹر تارا چند خسرو نے اپنی بہتر سال کی عمر میں سات سلطانوں کا زمانہ دیکھا، اکثر نے

ان پر عنایت کی، اپنے خاص ندیموں میں جگہ دی، عزت و اکرام کی نگاہ سے پرورش کی۔ کچھ حاسدوں کو یہ پسند نہ آیا، لیکن ان کی دشمنی سے کوئی نتیجہ نہ نکلا (امیر خسرو اور ہندوستان بحوالہ امیر خسرو مرتبہ سلیم احمد ص ۳۶۲) اس بلا نتیجہ حسد اور دشمنی کی بدلی ہوئی صورت موجودہ دور کے بعض اہل قلم اور اصحاب تحقیق میں بھی نظر آتی ہے۔

اگر خسرو ناشناسی نہ ہو تو ان کی دربار داری کا یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اگر خسرو کو کسی سلطان کی ضرورت رہی تو خود ہر سلطان اپنے لئے خسرو کو اس لئے ضروری سمجھتا رہا کہ ایک اچھے مورخ کی طرح ایک اعلی درجہ کا شاعر بھی بقائے دوام کا تاج اس کے سر پر رکھ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جلال الدین خلجی کی رحم‌دلی اور نیک دلی کی مدح کرنے والے امیر خسرو کو اس کے قاتل جانشین سلطان علاؤالدین خلجی نے بھی اپنے سے قریب تر رکھنا پسند کیا، اور اس کی پسندیدگی کچھ ایسی بڑھی کہ وہ میدان جنگ میں بھی ان کو ساتھ رکھتا، پھر خود جناب ممتاز حسین کو بھی اعتراف ہے کہ خسرو تخت شاہی کی مدح کرتے نہ کہ فلاں ابن فلاں کی۔ (ص ۲۱۱) وہ جس بات کو اچھی طرح واضح نہیں کر سکے اس کو بہت واضح طور پر ڈاکٹر تارا چند نے اس طرح لکھا ہے کہ حکومت کے متعلق خسرو کا نظریہ ہندوستانی اور ایرانی عقیدوں سے متاثر معلوم ہوتا ہے ، ہندوستان میں راجہ کا درجہ بہت ہی اونچا مانا جاتا ہے، راجا سے اگر کوئی اوپر ہے تو ایشور ہے، کالی داس نے رگھو خاندان کا رشتہ سورج دیوتا سے ملایا ہے اور تعریف میں ایسے بلند آہنگ اور پر شکوہ الفاظ استعمال کئے ہیں کہ ذہن پر عجیب اثر پیدا کرتے ہیں . . . . کالیداس کے ساتھ خسرو کی شاعرانہ تمجید کے شعروں پر کان لگائیے، علاؤالدین کو جن لفظوں سے یاد کرتے ہیں

ان میں وھی تان ھے جو سنسکرت میں سنائی دیتی ھے۔ . . وہ تمام بادشاھوں کو سراھتے ھیں، تعجب یہ ھے کہ بلبن اور علاؤالدین جیسے رعب اور دبدبہ والے بادشاھوں کے لئے بھی وھی زور دار الفاظ ھیں اور کیقباد جیسے عیش پسند اور جلال الدین جیسے نرم دل سلاطین کے لئے بھی وھی، وجہ یہ معلوم ھوتی ھے کہ اس زمانہ میں بادشاہ کی ذات اور حکومت کی قوت کو ایک سمجھا جاتا تھا، جو قوت کا حامل ھو وھی خدا کا سایہ، دین کا پشت پناہ، قطب دنیا جہاں کشا، رعایا کا نگہبان اور ملک کا محافظ تھا، چونکہ تعریف کا موضوع بادشاھت ھوتا نہ کہ شخص بادشاہ، اس لئے سب کے ایک ھی طرح گن گائے، یہی وصف ھندوستان کے مہاراجوں اور دھیراجوں اور یہی کسریٰ اور نوشیرواں میں ملتے ھیں (مضمون امیر خسرو اور ھندوستان بحوالہ امیر خسرو مرتبہ سلیم احمد ۳۸۷ - ۳۸۶) یہی باتیں اس راقم کے قلم سے نکلتیں تو اس کو حسن تاویل پر محمول کیا جاتا، مگر ایک ھندو مورخ کی یہ ساری باتیں حسن تاویل نہیں ھیں - بلکہ ایک مورخانہ تجزیہ ھے، گو اس سلسلہ میں ان کی تمام باتوں سے اتفاق کرنا ضروری نہیں، مگر خسرو کی دربار داری کا مطالعہ اس پہلو سے بھی کرنے کی ضرورت ھے -

امیر خسرو نے اپنی کسر نفسی بلکہ نفس کشی کی خاطر شاعرانہ انداز بیان میں اپنی درباری قصیدہ نگاری کو کذب گوئی اور سیہ روی پر محمول کیا ھے، ھمارے مصنف نے ان کے اس بیان سے فائدہ اٹھا کر ان کو کذب گو سیہ رو قرار دیا ھے - اگر خسرو محض اپنے درباری قصیدوں کی وجہ سے کذب گو اور سیہ رو ھیں تو پھر انوری، خاقانی، اسمعیل، اصفہانی، تاج الدین، فیضی، عرفی، شکیبی، نظیری، طالب آملی، کلیم، صائب، قدسی، اور پھر غالب، ذوق اور منیر شکوہ آبادی وغیرہ سب کو کاذب اور سیہ رو قرار دینا چاھئے - اس طرح

ہمارا فارسی اور اردو ادب ان کذابوں اور سیہ رؤں سے بھرا پڑا نظر آئیگا۔ قصیدہ نگاری کے فن سے جو بھی اچھی طرح واقف ہے وہ اس کی مبالغہ آرائی ہی کو اصلی وصف سمجھتا ہے۔ گو ہمارے مصنف کا خیال ہے کہ مبالغہ پر مبالغہ آرائی مبالغے کو بے معنی کردیتی ہے (ص ۳۹۹) مگر یہ ان کی ذاتی رائے ہے جس سے اتفاق کرنا ضروری نہیں۔ قصیدے کی مبالغہ آمیز مدح میں یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ یہ کس کے لئے کہی جارہی ہے۔ بلکہ اس پر غور کیا جاتا ہے کہ جو مدح کی جا رہی ہے اس کے حسن مبالغہ آرائی میں اس کا پر شکوہ اور باوقار انداز کیا ہے؟ اس میں صنائع و بدائع کے ساتھ نادر تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا استعمال کس طرح ہوا ہے، اس میں پند و نصیحت کس قسم کی دی گئی ہے، اور اگر سنگلاخ زمینوں کے عروض و بحور میں یہ مدح کہی گئی ہے تو اس سے قصیدہ نگار کس طرح عہدہ برا ہوا ہے۔ قصیدہ نگاری سے فن شاعری کو جو شعوری اور غیر شعوری طور پر فوائد پہونچے ان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ خسرو نے سلاطین کی شان میں جو قصائد کہے ان کو اسی حیثیت سے پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ فخر کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس بر صغیر کے ایک شاعر نے انوری، خاقانی، ظہیر فاریابی اور کمال اصفہانی کے طرز میں قصائد کہہ کر اپنے وطن کا نام روشن کیا، مولانا شبلی کس مسرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ ''خسرو کا کلام موجود ہے، مقابلہ کرکے دیکھ لو کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں''۔ ہمارے مصنف نے بھی لکھا ہے کہ امیر خسرو نے ظہیر فاریابی، خاقانی اور انوری ایسے جید اساتذہ کی زمینوں میں قصائد لکھے اور انہیں ان کی زمینوں اور مبالغہ آرائی میں شکست دینے کی کوشش کی (ص ۳۶۹) مگر مصنف نے ان کے ان شاعرانہ اوصاف کو یہ لکھ کر زائل کردیا ہے کہ ان کا تو رزق ہی انہی قصائد سے

بندھا ہوا تھا۔ (ص ۳۶۹) مگر وہ ایک جگہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ خسرو امیر بن امیر تھے (ص ۲۰۹) ان کے امیر بن امیر ہونے کے بعد مصنف کا یہ لکھنا کہاں تک صحیح ہے کہ ان کا تو رزق انہی قصائد سے بندھا ہوا تھا۔ اور اگر وہ صرف رزق ہی کی خاطر قصیدے لکھتے رہے تو پھر ان کو امیر خسرو کے اس بیان کا حوالہ نہ دینا چاہئے تھا کہ جو کچھ مجھے انعام و اکرام میں ملتا ہے اس میں دس گنا اضافہ کرکے میں سینکڑوں آدمیوں میں تقسیم کر دیتا ہوں (ص ۲۰۹)

امیر خسرو نے اپنی دربار داری ہی کے زمانہ میں اپنی ساری مثنویاں لکھیں۔ ان میں بعض مثنویاں ایسے سلاطین کے لئے قلمبند کی گئی ہیں جو اپنی سیرت کے لحاظ سے اچھے نہ تھے، مگر وہ لکھی گئیں، اور امیر خسرو نے ان کو اس طرح لکھا کہ ان پر ناز کیا جاسکتا ہے، اور اگر وہ نہ لکھی جاتیں تو شعر و ادب کا خزانہ ان جواہرات سے محروم ہو جاتا۔ ان کی قران السعدین، دول رانی و خضر خان، مفتاح الفتوح اور نہ سپہر آج قیمتی تاریخی ماخذ بنی ہوئی ہیں۔ امیر خسرو کی دربار داری کے عہد کی مثنوی نگاری کو بھی خاص زاویہ نگاہ سے پرکھنے کی ضرورت ہے، ہمارے مصنف امیر خسرو کو ایک مورخ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، وہ ان کی مثنویوں کے فن قصہ گوئی کو بھی کمزور بتاتے ہیں، مگر ان کو اس کا اعتراف ہے کہ امیر خسرو نے اپنی تاریخی مثنویوں میں کسی ایک یا مختلف تاریخی واقعات کے سہارے اپنے معاشرے اپنے شہر اپنے دیس کے مختلف مناظر پیش کئے ہیں اور ہر منظر میں ان کا دل الجھا ہوا نظر آتا ہے، ان مثنویوں میں انھوں نے ایک نگار خانہ طرح طرح کی تصویروں سے سجایا ہے، اور اگر ساری تصویروں کو یکجا کیا جائے تو یہ بات بلا کسی خوف تردید کے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنے شہر دھلی اور اپنے

دیس کی ایک ایسی جامع تصویر پیش کی ہے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ (ص ۲۶۷)

امیر خسرو نے اپنی دربار داری ہی کے زمانہ میں اپنے خمسہ (پنج گنج) کی تدوین کی، جس پر اس برصغیر کے تمام ارباب علم و ادب کو فخر ہے۔ گو ہمارے مصنف نے اس پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بہت ہی تشنہ اور عمومی رنگ کا ہے اور حق تو یہ ہے کہ اس خمسہ کے علی گڑھ اڈیشن میں مولوی مقتدیٰ خاں شیروانی، مولوی علی احمد خاں اسیر، مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شیروانی، مولانا محمد سعید فاروقی اور مولانا سید سلیمان اشرف نے اپنے اپنے مقدمے میں جو کچھ لکھ دیا ہے اس میں مدت مدید تک شاید کوئی اضافہ نہ ہو سکے گا اور اسی کی خوشہ چینی ہوتی رہے گی۔ مولانا محمد سعید فاروقی آئینہ سکندری کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں کہ امیر خسرو کی نسبت اس پر اتفاق ہے کہ جتنے خمسے نظامی کے جواب میں لکھے گئے سب سے بہتر ہے۔ دولت شاہ سمرقندی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر بائس نفر امیر خسرو کو نظامی پر ترجیح دیتے تھے۔ مگر خاقانی مغفور الغ بیگ نظامی کے معتقد تھے اور اس ترجیح کو قبول نہیں کرتے تھے، ان دونوں بادشاہوں میں اس بارہ میں مذاکرہ ہوا، اس زمانہ کے اہل علم و فضل ترجیح کو پسند کرتے تھے . . . . گویا ان بزرگوں کے نزدیک امیر خسرو علیہ الرحمہ کا خمسہ نظامی کے خمسہ سے فائق تھا، جو ہر ہندی نژاد کے لئے باعث افتخار ہے۔

امیر خسرو کی دربار داری کے تاریک پہلو خواہ کتنے ہی دکھائے جائیں مگر اس زمانہ میں انھوں نے جو کارنامے انجام دئے اور ان کی بدولت ہر ہندی نژاد کو جو افتخار حاصل ہوا اس کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ پھر اس دربار داری میں امیر خسرو اپنے شاہی آقاؤں کی محض مزاجداری اور

تنہا مداحی ھی نہیں کرتے رھے، بلکہ ایک فرض شناس شاعر اور ندیم کی حیثیت سے ان کو جابجا نصیحتیں بھی کرتے رھے ۔ مولانا سلیمان اشرف نے ھشت بہشت کو ایڈٹ کرتے وقت اس کے مقدمہ میں ان نصیحتوں پر بڑی اچھی بحث کی ھے، جس سے ھمارے مصنف نے بھی استفادہ کیا ھے ۔ اور انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا ھے کہ خسرو اپنی مثنوی آئینہ سکندری میں آیۃ ''ان الملوک،، کی تفسیر لکھتے ھوئے بادشاھوں کو رحمدل ھونے کی تلقین کرتے ھیں اور مطلع الانوار تو اس قسم کی نصیحتوں سے بھری ھوئی ھے (ص ۴۰۶) ان نصیحتوں کو ھمارے مصنف نے زیادہ پھیلا کر لکھنا پسند نہیں کیا ھے ۔ اگر ان کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو یہ حکمرانی کا مفید دستور العمل بن سکتا ھے ۔ خسرو کی دربار داری کے سلسلہ میں خسرو شناسی کا ایک پہلو یہ بھی ھے اور جو ھم کو اور آپ کو لکھنا چاھئے تھا، اس کو ڈاکٹر تارا چند نے اس طرح لکھا ھے کہ خسرو نے جہاں بادشاھوں کی ستائش میں قصیدے کہے ھیں وھاں نصیحتوں کے دفتر بھی کھول دئے ھیں ۔ سب سے زیادہ زور عدل پر ھے ۔ فرماتے ھیں ۔ ''سب سے پہلے یہ کہ اگر تو سلطنت کو مضبوط بنانا چاھتا ھے تو اپنی بادشاھی کی بنیاد انصاف پر رکھ، بادشاھوں کے لئے ھر حال میں انصاف پسندی سے بہتر کوئی پیشہ نہیں ۔ جہاں تک ھوسکے دین و انصاف کو ملحوظ خاطر رکھ، کیونکہ سلطنت ان ھی دوپایوں پر برقرار ھے، عدل ھی تمہارا حرز جان ھے، اور تیرے تخت و تاج کے لئے انصاف پونجی کی حیثیت رکھتا ھے، اور آسمان تیری قسمت کے بچے کا کھیل بن جاتا ھے، اپنی رعیت پسندی کی بناء انصاف پر رکھوانے کا کام کرتا ھے اور بھیڑیے اور بکری میں مصالحت کا برتاؤ کرا دیتا ھے، اگرچہ تیرے جسم کا کوئی دشمن نہیں لیکن تیری لاپرواھی ھی بس تیری دشمن ھے، اگرچہ تیرے پیچھے سینکڑوں محافظ ھوتے ھیں لیکن تیری محافظت

تیرے سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا، لیکن اس درجہ تک تجھ کو پہنچانے والی تیری مستقل مزاجی ہے اور تیری نگہبان خود تیری عقلمندی اور دانش وری ہے۔"

ڈاکٹر تاراچند نے اوپر جو کچھ لکھا اس کی سند میں خسرو کے اشعار بھی پیش کئے ہیں جن کو یہاں پر حذف کردیا گیا ہے۔ آخرمیں وہ لکھتے ہیں کہ خسرو کے نزدیک بادشاہ کے اوصاف یاد خدا، خوش نیتی، نیکی، راستی، فروتنی، قناعت، مظلوموں کی دادرسی اور مفلس نوازی وغیرہ ہیں۔ غرض یہ کہ بادشاہ جس کا نام ہے ایسے انسان کامل ہونا چاہئے کیونکہ یتھا راجا تتھا پرجا (خسرو اور ہندوستان بحوالہ اسیر خسرو مرتبہ سلیم احمد ص۳۸۹ - ۳۸۷)

ان نصیحتوں سے اتنا تو ضرور اندازہ ہوگا کہ خسرو کو بادشاہوں کی ندیمی میں اپنی فرض شناسی کا بھی احساس رہا، اور اپنی سلامت روی میں اچھے قسم کے فرائض انجام دیتے رہے، پھر خود مصنف کو بھی یہ اعتراف ہے کہ خسرو کی درباری اور نجی زندگی کچھ بھی رہی ہو اس میں شبہہ نہیں کہ وہ عشق الٰہی میں ایک دیدۂ نمناک رکھتے تھے (ص ۴۰۸) یہی وجہ ہے کہ ان کی درباداری میں ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کو کوئی ایسی بات محسوس نہ ہوئی جس سے ان کو دربار سے ترک تعلق کرنے کا حکم دیدیتے۔ بلکہ ان کو یقین کامل رہا کہ ان کی تعلیمات کی وجہ سے خسرو کے قلب کے سویدا میں خدا کی محبت اتنی راسخ ہو چکی ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے ان کی سیرت کندن کی طرح چمکتی رہے گی، ان کے کردار کی پاکیزگی اور ان کے دل کی طہارت کسی ماحول کی رندی اور سرمستی سے داغدار نہ ہوگی، ان کی دنیاوی کامیابی کے ساتھ ان کا روحانی ارتقا بھی ہوتا رہے گا، ان کے مرشد کا یہ خیال بالکل صحیح ثابت ہوا۔ یہ غور کرنے کی بات ہے آخر دونوں ایک

دوسرے کے فریفتہ کیوں رہے، بقول مولانا شبلی امیر خسرو خواجہ نظام الدین اولیاء کا جمال دیکھ کر جیتے تو خواجہ نظام الدین اولیاء کو بھی ان کے ساتھ یہ تعلق تھا کہ فرمایا کرتے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لائے تو خسرو کو پیش کروں گا۔ دعا مانگتے تو خسرو کی طرف اشارہ کرکے فرماتے، الٰہی ! بہ سوز سینہ ایں ترک مرا بہ بخش، اس روایت کو خود ہمارے مصنف نے یہ لکھ کر تسلیم کیا ہے کہ نظام الدین اولیا خسرو . . . کو ترک اللہ کے خطاب سے یاد کرتے اور ان کے سوز دل کی وہ اتنی قدر کرتے کہ اپنی بخشائش ان کے سوز دل کے صلے میں ڈھونڈتے (ص ۲۱۱-۲۱۰) سیر الاولیاء کی روایت ہے کہ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو بہشت بھیجا گیا تو خسرو کے ساتھ جاؤنگا (سیر الاولیاء ص ۲۰۳) کیا یہ فریفتگی اور شیفتگی ایک سیاہ کار ، سیہ رو، کذاب، اور طماع زر درباری کے لئے تھی ؟

امیر خسرو کی دربار داری کے ان روشن اور افادی پہلوؤں کا احساس ہمارے مصنف کو رہا بھی اور نہیں بھی رہا، کیونکہ ایک جگہ تو وہ یہ لکھتے ہیں :

> وہ یعنی امیر خسرو اپنی امیری، مرفہ الحالی، بندگی شاہ اور اپنے صوفیانہ اعتقادات میں کوئی تضاد محسوس نہیں کرتے، بقول کسے
>
> کمر بخدمت سلطان ببند و صوفی باش (ص ۲۰۶)

مگر دوسری جگہ یہ لکھ کر خسرو کی ہجو اور مذمت کی ہے۔

''سلاطین دھلی . . . کے بہیمانہ اور سازشی ماحول میں خسرو کو زندہ رہنے کے لئے ایک ماہر سیاست کا کردار ادا کرنا پڑا، وہ جس بساط سیاست میں ندیمی کی خدمات انجام دے رہے تھے، اس میں ہمیشہ ان کے پٹنے کا

بھی خدشہ ہوتا، چنانچہ بادشاہوں کے غیظ و غضب سے کچھ بچنا ہی ان کا کام نہ تھا بلکہ اس پر بھی نگہ رکھنی ہوتی کہ سیاست کا جو رخ ہے جو ریشہ دوانیاں اور سازشیں چل رہی ہیں ان کے پیش نظر چتر شاہی کس کے سر پر سایہ فگن ہونے کو ہے ۔ چنانچہ خسرو اپنی اسی سیاست سے اتنے بہت سے بادشاہوں کو جھیل گئے ورنہ وہ کب کے گور میں قبلہ رو سوئے ہوتے (ص ۲۱۶)

اوپر کے اقتباس میں ہمارے مصنف کا جو طرز بیان ہے، اسی سے اندازہ ہوگا کہ ان کے قلم کی روح کیسی ہے، ان کی یہی روح زیادہ کارفرما اس وقت ہو جاتی ہے جب وہ امیر خسرو کے صوفیانہ مشرب پر اپنی تبصرہ نگاری کا جوہر دکھاتے ہیں، امیر خسرو نے راہ سلوک پر گامزن ہوکر دین و دنیا کی جو حسین آمیزش کی، وہ ہندوستان میں نہ صرف تصوف بلکہ مذہب کی ایک بہت ہی دل آویز تاریخ ہے ۔ سیرالاولیاء اس دور کا بہت ہی مستند تذکرہ سمجھا جاتا ہے، اس میں امیر خسرو کے شغل عبادت، تلاوت کلام پاک، تہجد گزاری شب بیداری، نیم شبی گریہ و زاری، امور نامرضیہ شرع سے اجتناب، بطالت روزگار سے پرہیز، مرشد سے شیفتگی کے بہت سے واقعات درج ہیں ۔ امیر خسرو کے ایمان کی جبیں پر جو عشق الہی تابندہ رہا، ان کے رخسار یقین پر شریعت کا جو حسن درخشندہ رہا، یا وہ اپنے افعال میں اپنے مرشد کے حسن ارادت کے جس طرح رہین رہے، ان سب کا ذکر تمام تذکرہ نگاروں نے بہت ہی والہانہ انداز میں کیا، مگر ہمارے مصنف نے ان سب پر پانی پھیرنے کی کوشش کی ہے ۔ بعض خسرو ناشناس کی طرح وہ حضرت خواجہ سے امیر خسرو کے مرید ہونے کے تو منکر نہیں، مگر اس سلسلہ میں ان کے تمام مباحث بہت ہی گنجلک ہیں ۔ وہ یہ تو لکھتے ہیں کہ امیر خسرو حضرت خواجہ کے مرید سے زیادہ

ان کی مراد تھے، مرید مبتدی کو کہتے ہیں اور مراد منتہی کو (ص ۲۰۶) مگر آگے چل کر یہ تحریر کرتے ہیں :

''ان کی عقیدت شیخ نظام الدین سے کچھ اس بنیاد پر نہ تھی کہ منجملہ اور صوفیوں کے وہ بھی ایک صوفی تھے، بلکہ ان کے ذاتی اوصاف کی وجہ سے تھی، وہ ایک مرید سے زیادہ ان کے دوست، یار غار تھے (ص ۲۱۰)

اگر امیر خسرو کی عقیدت نظام الدین اولیاء سے محض صوفی کی حیثیت سے نہ تھی تو ان کو دریائے ابرار و سحاب آبدار، نظام جواہر دین و فرید عقد یقین اضاء اللہ فی سلک المقربین کالدر الثمین (مطلع الانوار) شیخ عالم اجل محی السنن نظام الملت فضلے کہ قدم بشر حافی را از نعلین طریقت فرو پوشد و ادھمی کہ سری سقطے را سر صفا روشن کرد (آئینہ سکندری) پھر ان کو جا بجا قطب زماں، پناہ ایماں، سر جملہ کریماں، جنید ثانی، دل جہاں پناھی، قبلہ حاجات، کعبہ مرادات، پیر دست گیر اور مرشد کامل وغیرہ نہ لکھتے اور نہ یہ سب کچھ دوست اور یار غار کے لئے لکھا جاتا۔ مثنوی مطلع الانوار میں تو وہ اپنے کو حضرت خواجہ کا غلام کہتے ہیں۔

مفتخر از وی بہ غلامی منم　　خواجہ نظام است و نظامی منم

وہ مثنوی لیلی و مجنوں میں بھی اپنے کو حضرت خواجہ کا ادنی چاکر بتاتے ہیں۔

مسند ز سپہر بر ترش باد　　خسرو چو ستارہ چاکرش باد

دول رانی و خضر خان میں شیخ کی مدح کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔

زھے بخت ار تہ کفشش بمیرم

اس طرح مرنے کی آرزو ایک دوست نہیں بلکہ ایک ادنیٰ مرید ھی کرتا ھے۔ امیر خسرو کے معاصر اور دوست مولانا ضیاء الدین برنی امیر خسرو

کو حضرت خواجہ کا دوست اور یار غار بتانے کے بجائے لکھتے ہیں کہ میں نے اتنا عقیدت مند کوئی اور مرید نہیں دیکھا، جس کا حوالہ خود مصنف نے بھی دیا ہے (ص ۲۳۰) پھر ہمارے مصنف کا یہ بیان کہ وہ ایک مرید سے زیادہ ان کے دوست اور یار غار تھے، دونوں کے روحانی تعلقات کی اہمیت کو محض کم کرنے ہی کے لئے تو ہے۔

امیر خسرو کب حضرت خواجہ کے مرید ہوئے اور اپنی عمر کے حصہ میں صوفی بنے اس بحث کو مصنف نے خواہ مخواہ پیچیدہ اور گنجلک بنا دیا ہے۔ مصنف اگر تمام تذکرہ نگاروں کی یہ روایت تسلیم کر لیتے کہ امیر خسرو اپنی ابتدائی عمر میں حضرت خواجہ کے مرید ہو گئے تھے اور بقول مولانا شبلی حضرت خواجہ کی روحانی تاثیر چپکے چپکے کام کرتی رہی۔ یا اگر وہ مولانا شبلی کی اس رائے سے اتفاق کر لیتے کہ امیر خسرو سر تا پا عشق تھے اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی یا اگر وہ خسرو کے عشق کو عشق الٰہی تصور کر لیتے جیسا کہ ان کو خود اعتراف ہے کہ امیر عشق الٰہی میں ایک دیدۂ نمناک رکھتے تھے (ص ۴۰۸) تو پھر ان کو اس کی بحث کرنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ وہ شیخ کے مرید کس زمانہ میں ہوئے اور کب صوفی بنے۔ اس بحث میں پڑ کر ان کی تحریروں میں بڑا تضاد ہو گیا ہے جس کی خبر ان کو نہیں وہ یہ تو لکھتے ہیں کہ امیر خسرو کے ابتدائی دیوان تحفۃالصغر کے دیباچہ میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا ذکر خیر ہے (ص ۱۹۶) مگر معلوم نہیں یہ کیسے لکھ گئے کہ شیخ کی مدح میں ان کی کوئی نظم یا قصیدہ ان کے دیوان تحفۃ الصغر میں نہیں ہے۔ (ص ۱۹۶) مدح میں نظم یا قصیدہ تو تحفۃ الصغر میں نہیں لیکن اس میں ترجیع بند ضرور ہے۔

جناب سعید سارهروی نے ۱۹۰۳ء میں حیات خسرو لکھی تھی، اس میں وہ تحفۃ الصغر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں ترجیع بند عموماً حضرت نظام الدین اولیا یا سلطان بلبن کی شان میں ہیں (حیات خسرو در امیر خسرو مرتبہ شیخ سلیم احمد ص ۲۰۰) نواب محمد اسحاق خاں ۱۹۱۵ میں جب امیر خسرو کے کلام کو جمع کر رہے تھے تو ان کے پاس تحفۃالصغر کا جو نسخہ تھا اس پر وہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے ترجیع بندوں میں مصنف یعنی خسرو نے زیادہ تر اپنے ہادی طریقت حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء قدس سرہ العزیز کی تعریف کی ہے (مضمون ترتیب کلیات امیر خسرو در امیر خسرو مرتبہ شیخ سلیم احمد ص ۳۰۰) تحفۃ الصغر میں امیر خسرو کا وہ کلام ہے جو بقول مصنف انھوں نے سولہ سے انیس برس کی عمر میں کہا (ص ۳) اس عمر میں وہ حضرت خواجہ کے یار غار نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت خواجہ کی ولادت ۶۳۴ھ اور امیر خسرو کی پیدائش بقول مصنف ۶۵۱ھ میں ہوئی (ص ۴۹) سترہ سال کے اس تفاوت سے یہ بات قابل قبول نہیں کہ امیر خسرو حضرت خواجہ کے محض یار غار تھے جس ذکر خیر کا حوالہ مصنف نے دیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ تحفۃالصغر کی ترتیب کے وقت یا اس سے پہلے وہ حضرت خواجہ کے مرید ہو چکے تھے۔ مصنف کا یہ بھی بیان ہے کہ وسط الحیات کے دیوان میں جو خسرو کی ۳۲ سال کی عمر تک کا مجموعہ کلام ہے، ایک قصیدہ شیخ کی مدح میں ملتا ہے (ص ۱۹۶) پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ خسرو اور شیخ نظام الدین اولیاء کے باہمی تعلقات بلبنی سلطنت کے اواخر میں استوار ہو چکے تھے (ص ۲۰۱) بلبنی عہد کے اواخر میں خسرو کی عمر ۳۲ سال ہو چکی تھی ظاہر ہے کہ باہمی تعلقات کی یہ استواری پیری مریدی ہی کی تھی، یار غار کی نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ

ہے کہ امیر خسرو کے صوفیانہ خیالات عمر کے سولہ سال سے شروع ہوکر ۳۲ سال تک استوار ہوچکے تھے۔ پھر ہمارے مصنف کا یہ لکھنا تعجب انگیز ہے کہ خسرو پچاس سال کے پیٹے میں تھے تو ان کی طبیعت صوفیانہ خیالات کی طرف مائل ہوگئی۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ان کی عقیدت شیخ نظام الدین اولیاء سے اس زمانہ میں زیادہ بڑھی اور وہ تویہ کی طرف مائل ہوگئے (ص ۲۰۷) اس تحریر کے بعد آگے چل کر یہ بھی لکھ گئے ہیں :

"جب خسرو کو قران السعدین لکھنے کے صلے میں خاطر خواہ انعام معزالدین کیقباد سے نہ ملا تو ان کا دل تصوف کی طرف زیادہ مائل ہو گیا۔ (ص ۲۰۷)

واضح رہے کہ قران السعدین لکھتے وقت ان کی عمر ۳۵ سال کی تھی۔ اور پھر اس تحریر کو بھی بھول کر وہ یہ لکھتے ہیں کہ کہا جا سکتا ہے کہ علائی عہد کے اواخر میں وہ ایک مستقیم الحال صوفی ہو چلے تھے (ص ۲۳۰) علاؤالدین خلجی کی وفات ۷۱۶ ہجری میں ہوئی۔ امیر خسرو کی پیدائش مصنف کے قول کے مطابق ۶۵۱ ہجری میں ہوئی اس طرح علاؤالدین خلجی کی وفات کے وقت امیر خسرو کی عمر تقریباً ۶۵ سال کی ہوتی ہے۔

مصنف اپنی تحریروں کی اس شترگربگی کے ساتھ غصہ میں یہ بھی لکھ گئے ہیں۔

جعلی کتابوں اور افسانوں کی مدد سے امیر خسرو کی تصویر میں غلط رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں، ایک رند با صفا کو خانقہی صوفی بنا کر پیش کیا گیا ہے، امیر خسرو کی عقیدت شیخ سے خواہ کتنی ہی گہری کیوں نہ رہی

انھوں نے اپنی رندی اور جاہ طلبی کو خیر باد نہیں کہا (ص ۱۴ - ۳۱۳)

مگر اس سے پہلے وہ یہ بھی لکھ گئے ھیں کہ وہ ایک مجاھد صوفی بھی تھے، ان کا تصوف مجاھدانہ تھا، نہ کہ عزلت گزینی کا، وہ اپنے سوز دل کو آزماتے اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھتے (ص ۲۹۲) خسرو کو مجاھد صوفی کہہ کر ان کو رند کہنا کہاں تک درست ھے۔ ایک جگہ امیر خسرو کے اشعار کا حوالہ دے کر مصنف یہ بھی لکھتے ھیں کہ وہ اپنے پیر شیخ نظام الدین اولیاء میں انوار الھی کا جلوہ دیکھتے اور انہیں نائب رسول اور ان کے الہامات کو نائب وحی قرار دیتے (ص ۳۸۶) یہ تو ایک رند کی نہیں بلکہ ایک خانقہی صوفی ھی کی تصویر ھے۔

ھمارے مصنف کا بیان ھے کہ جعلی کتابوں اور افسانوں کی مدد سے امیر خسرو کی تصویر میں غلط رنگ آمیزیاں کی گئی ھیں۔ سیرالاولیا کوئی جعلی کتاب نہیں، خود ھمارے مصنف نے لکھا ھے کہ خسرو پر لکھنے والا کوئی بھی طالب علم سیرالاولیا کو نظر انداز نہیں کر سکتا (ص ۹) اسی میں ھے کہ امیر خسرو تہجد کے وقت قرآن کریم کے سات سپارے تلاوت کرتے۔ ایک دن شیخ نظام الدین اولیا نے پوچھا اے ترک تمہاری مشغولیتوں کا کیا حال ھے، عرض کیا کہ رات کے آخری حصہ میں اکثر اوقات گریہ و زاری غالب آجاتی ھے، فرمایا الحمدللہ قدرے ظاھر ھونا شروع ھوا، اس روایت کو شیخ عبدالحق دھلوی نے بھی اخبار الاخیار میں نقل کیا ھے، جس کی ھر روایت بہت ھی چھان بین کرکے لکھی گئی ھے۔ اسی لئے یہ بہت ھی مستند تذکرہ سمجھا جاتا ھے۔ اسی میں یہ بھی ھے کہ شیخ نے اپنے دست خاص سے جو خطوط امیر خسرو کو لکھے، ان میں ایک یہ ھے کہ جسم کی حفاظت کے

ساتھ شریعت کے ناپسندیدہ امور سے پرہیز کیا جائے۔ شیخ عبد الحق محدث دھلوی نے امیر خسرو کی خوبیوں سے متاثر ہوکر لکھا ہے کہ وہ برھان الفضلا اور نوع انسانی میں منتخب دو جہاں اور بے پایاں تھے (اخبار الاخیار ص ۹۳ - ۹۲) مولانا ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروزشاھی نہ جعلی کتاب اور نہ افسانوں کا مجموعہ ہے، اس میں امیر خسرو کی یہ مرقع آرائی کی گئی ہے :

''وہ مستقیم الحال صوفی تھے، ان کی عمر کا بیشتر حصہ صوم و صلوۃ اور قرآن خوانی میں گزرا، وہ متعدی اور لازمی عبادات میں یکتا تھے، اور ھمیشہ روزہ رکھتے تھے . . . عشق و محبت الٰہی سے ان کو پورا حصہ ملا تھا،،۔ (اردو ترجمہ ص ۵۲۲)

مولانا ضیاء الدین برنی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاید خواجہ سنائی نے یہ شعر امیر خسرو ھی کے متعلق کہا ہے :

به خدا ار به زیر چرخ کبود همچو او هست وبود خواهد بود

(خدا کی قسم اس نیلے آسمان کے نیچے جو ان جیسا کوئی ہے یا تھا، یا ہوگا، (ص ۵۲۲)

مگر اس کو کیا کیجئے کہ ھمارے مصنف کو خسرو میں رندی کے علاوہ سیہ کاری، سیہ روی، کذب گوئی، رنگین مزاجی اور جاہ طلبی ھی کی برائیاں نظر آئیں۔

مصنف نے امیر خسرو کے ساتھ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ کے جماعت خانہ کو بھی اپنے قلم کے ناوک سے نخچیر کیا ہے، لکھتے ھیں :

''شیخ نظام الدین کا جماعت خانہ ایک ادب گاہ جمالیات بھی تھا، اس زمانے میں کسی بھی ایسے شاعر کے لئے جو کچھ مذاق تصوف بھی رکھتا

ہو، اس کی تربیت شاعری کے لئے اس درسگاہ سے گزرنا ضروری تھا، اس درسگاہ کی ہر محفل سماع شعر و نغمہ طرب گاہ وجدان تھی، ہر شئے سنگیت میں ڈھلی ہوئی، آہنگ حرف ہو یا پاکوبی رقص، ان کے عرفان و آگہی بے خودی کا کیا کہنا، اس آستان کا ہر شاعر وحدت الوجود میں ڈوبا ہواتھا . . . پھر اسی معرفت وحدت الوجود کی نسبت کا ذوق حسن پرستی بھی تھا . . . اس بارگہ نظامی سے خسرو کا دور رہنا ان کی کور ذوقی کا ثبوت ہوتا،، (ص ۲۰۶-۲۰۵)

محفل سماع کے شعر و نغمہ اور ڈھلی ہوئی سنگیت کے حروف آہنگ، خانقاہ کے رقص کی پاکوبی اور عام رقص کی طرب ادائی، عارفانہ احساس جمال اور ذوق حسن پرستی میں بڑا فرق ہے، مگر مصنف نے ان سب کو ایک ساتھ خوبصورت انداز میں جمع کرکے اور وحدت الوجود کو اپنے طنز کا نشانہ بناکر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے اس جماعت خانہ کی تصویر کھینچی ہے جس کے فیوض کی تفصیل لکھنے میں مولانا ضیاء الدین برنی کا قلم رکتا نظر نہیں آتا ۔ وہ لکھتے ہیں کہ لوگ ان کے سامنے اپنے گناہوں کا اقبال کرتے اور ان سے توبہ کرتے، وہ ان کاموں سے پرہیز کرنے لگے تھے جو کرنے کے لائق نہیں تھے، گناہوں کے ارتکاب اور ان کے متعلق لوگوں میں بہت کم بات چیت ہوتی تھی ۔ قدیم مریدوں کو بندگی و عبادت، ترک و تجرید، سلوک کی کتابیں پڑھنے اور مشایخ اور بزرگوں کے حالات اور واقعات کا ذکر کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا ۔ یہ لوگ دنیا اور دنیاداروں کا ذکر اپنی زبان پر نہ لاتے، دنیا کے کارخانے کی طرف نظر نہ کرتے، دنیا اور اہل دنیا کے قصے نہ سنتے، ان سب چیزوں کو وہ معیوب بلکہ معاصی میں شمار کرتے تھے (ملخصاً تاریخ فیروز شاہی، اردو ترجمہ ص ۵۰۶-۵۰۰)

ہمارے مصنف کے طنز و تضحیک کی ناوک فگنی ہر سمت میں دیکھی

جا سکتی ہے، مولانا ضیاءالدین برنی نے لکھا ہے کہ :

''برسوں امیر خسرو، امیر حسن اور میرے درمیان محبت اور یگانگت کے تعلقات رہے ہیں، نہ وہ میرے بغیر رہ سکتے تھے، اور نہ میں ان کی ہم نشینی کے بغیر زندگی بسر کر سکتا تھا، میری ملاقات کی وجہ سے ان دونوں حضرات میں تعلقات اور ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا . . . امیر حسن کی صحبت اس قدر شیریں ہوتی تھی اور وہ ایسے ظریف، خوش مزاج با ادب اور مہذب تھے کہ ہم لوگوں کو جو راحت اور کشش ان کی ہم نشینی میں حاصل ہوتی کسی اور کی صحبت میں نہیں ملتی تھی،، (تاریخ فیروز شاہی اردو ترجمہ ص ۵۲۳)

مگر امیر خسرو اور امیر حسن کی محبت، یگانگت، اور ہم نشینی کی راحت اور کشش کو ہمارے مصنف نے زائل کرنے کی کوشش کی ہے، وہ پہلے تو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ امیر حسن اور امیر خسرو میں معاصرانہ چشمک رہی (ص ۱۵۲) پھر یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ دنیا جانتی ہے کہ امیر خسرو کے سب سے بڑے حریف حسن علاء سنجری تھے (ص ۱۵۶) پھر دونوں کی حریفانہ چشمک پر یہ رائے زنی کرتے ہیں -

جو داستان محبت امیر خسرو اور امیر حسن علاء سنجری کی گھڑی گئی ہے اور جس کو مولف تاریخ فرشتہ نے آب و تاب کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ تمام تر غلط ہے اور ایک سفاکانہ طنز ان دونوں کے اس رویے پر ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی بے اعتنائی اور خاموشی سے قتل کرنا چاہتے تھے - (ص ۱۶۱)

مصنف نے مولانا ضیاءالدین برنی کی روایت کو نظر انداز کرکے اپنی

مذکورہ بالا تحریر میں جو سفاکانہ طنز کیا ہے اسکو معلوم نہیں ان کے ناظرین کس نظر سے دیکھیں گے ۔ امیر حسن کی شاعری پر مصنف نے جو تبصرہ کیا ہے، اس میں بھی یہ سفاکانہ طنز ہے، وہ لکھتے ہیں :

''انھوں نے ۵۵ سال کی عمر میں حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں بیعت کی، اس وقت سے ان کے کلام میں کہیں کہیں کچھ عارفانہ رنگ جگہ پانے لگتا ہے ورنہ اس سے پہلے ان کا کلام بیشتر عاشقانہ اور اگر آپ اجازت دیں تو فاسقانہ بھی ہے،، (ص ۱۶۰)

یہ تبصرہ اس شاعر پر ہے جس کے متعلق ان کے معاصر مولانا ضیاءالدین برنی نے لکھا ہے :

''نظم و نثر میں ان کی بہت سی تالیفات ہیں، تراکیب کی سلاست اور عبارت کی روانی میں ان کو انتہائی کمال حاصل تھا، چونکہ انھوں نے بہت سی وجدانی غزلیں کہی ہیں جن میں بہت زیادہ روانی ہے ، اس لئے ان کا خطاب سعدی ہندوستان ہوگیا تھا،، (تاریخ فیروز شاہی اردو ترجمہ ص ۵۲۲) ۔

مگر ہمارے مصنف کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ امیر حسن کو ہندوستان کا سعدی تسلیم کریں، خواہ وہ شعراء کے تذکروں میں سعدی ہند ہی کیوں نہ مان لئے گئے ہوں ۔ انھوں نے امیر خسرو کی یہ تصویر بھی کھینچی ہے ۔

''کوئی بھی ایسا ادارہ نہ تھا جس کی خسرو نے تنقید نہ کی ہو، صوفیان پشمینہ پوش اور غازیان دین سے لے کر قاضی اور مفتی ہر ایک کی تنقید کی ہے . . . خسرو جو اس قدر چومکھی جنگ کرتے ہوئے نظر آتے

ہیں، وہ اسی وجہ سے کہ ان کی وابستگی زندگی کے ساتھ شدید تھی،، (ص ۲۹۱) خسرو نے چوسکھی جنگ کی یا نہیں، اس کو سر دست نظر انداز کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود ہمارے مصنف نے اپنی اس کتاب میں اسی قسم کی جنگ کی ہے ۔ مولاناشبلی، ڈاکٹر وحید مرزا، سیر الاولیا، تذکرہ دولت شاہ، تاریخ فیروز شاہی اور میخانہ کے مولفوں، امیر حسن، سنجری، فقہائے اسلام، مفتیان دین اسلام اور صوفیائے کرام کے خلاف اپنے سفاکانہ طنز کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ایک جگہ تحریر کرتے ہیں :

''اسلام میں پاپائیت تو نہ تھی، لیکن جبہ و دستار سے خوفزدگی یقیناً تھی اور اس حد تک کہ آئے دن محاضرہ طلب کیا جاتا، مفتیان دین کو آواز دی جاتی کہ وہ ایسے فتوے صادر کریں اور جلاد کو حکم دیں کہ دار و رسن کو تیار رکھیں،، ۔ (ص ۸۵)

مفتیان دین کے بعد صوفیائے کرام کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو یہ لکھ کر اپنے قلم کا جوہر دکھاتے ہیں :

''جہاں تک سلسلہ سہروردیہ کے صوفیہ کا تعلق ہے وہ خدمت شاہ کا خیر مقدم کرتے، اور بادشاہ کی مدد معاش پر تکیہ کرتے، چشتیہ سلسلے کے مشائخ بھی بادشاہوں کی فتوح کبھی کبھی قبول کرتے، خود شیخ نظام الدین اولیا نے بقول فرشتہ پانچ لاکھ ٹنکہ زر ملک خسرو خان کے ہاتھ سے اس وقت قبول کیا جب وہ تخت شاہی پر جلوہ گر ہوا تھا،، (ص ۲۰۹)

صوفیائے کرام نے جس کو فتوح اور دست غیب کا نام دے رکھا تھا، اس کو ہمارے مصنف نے بھیک کہا ہے، اور اس پر یہ تبصرہ کیا ہے :

''مانا کہ وہ امراء سے حاصل کی ہوئی دولت کو غرباء میں تقسیم کرتے یا اس سے لنگر خانہ چلانے کی خدمت انجام دیتے، لیکن اس گدائی کے برے اثرات معاشرت پر پڑ رہے تھے''۔ (ص ۲۰۹)

پھر اس زمانے کے تمام مشایخ پر یہ کہہ کر حملہ آور ہوئے ہیں:

اس زمانے کے کسی شیخ کا دامن مختلف قسم کے الزامات سے پاک تھا۔ (ص ۲۱۲) حضرت شیخ نظام الدین اولیاء پر تو یہ الزام بھی رکھنے کی کوشش کی ہے کہ وہ خسرو خان کے ساتھ قطب الدین کے قتل کی سازش میں شریک تھے جیسا کہ ان کی حسب ذیل عبارت سے ظاہر ہوگا۔

''سوال یہ ہے کہ جو لوگ کہ پیروں کی کراسات کے قائل نہیں، یا جو پیر پرستی کے خلاف ہیں یا وہابی عقائد رکھتے ہیں، وہ اگر اس قسم کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ خسرو خان نے شیخ سے مل کر قطب الدین کا کام تمام کیا، اور جو فتوحات کہ شیخ نے خسرو سے اس کے بر سر اقتدار آنے کے بعد حاصل کی تھیں وہ اسی اعانت کا صلہ تھیں، تو ہمارے پاس دفاع میں کہنے کو کیا رہ جاتا ہے ؟ (ص ۲۶۲) (جاری)